پروفیسر محمد یونس میؤ *

ڈاکٹر حمید اللہؒ اور معاصر شخصیات

(علمی و فکری روابطہ)

ڈاکٹر محمد حمید اللہ (۱۹ فروری ۱۹۰۸ء۔ ۱۷ دسمبر ۲۰۰۲) کا شمار اس صدی کے بڑے عالموں میں ہوتا ہے۔ آپ اس صدی کے ممتاز ترین محقق بھی تھے۔ اور اگر ہم اپنے تہذیبی اور مذہبی روابط سے قطع نظر مسلکی پابندیوں سے آزاد ہو کر اور جملہ علمی نسبتوں کا احترام کرتے ہوئے آپ کی چھوڑی ہوئی علمی و فکری میراث اور یورپ پر آپ کے دعوتی اثرات کا ایک جائزہ مرتب کریں تو بلاشبہ آپ عالم اسلام کے ممتاز ترین عالم، محقق اور مبلغ قرار پاتے ہیں۔

آپ نے آبائی شہر حیدر آباد جامعہ نظامیہ سے درس نظامی کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۳۰ء میں عثمانیہ یونیورسٹی سے ایم اے، ایل ایل بی کیا۔ یہیں سے ''قانون بین المسالک'' کے عنوان سے اپنی تحقیقات کا آغاز کیا۔ بون یونیورسٹی جرمنی سے ۱۹۳۳ء میں ڈی فل کا امتحان پاس کیا۔ اور سوربون یونیورسٹی پیرس سے ۱۹۳۵ء میں ڈی لٹ اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ حیدر آباد تشریف لائے اور مادر علمی میں ۱۹۴۸ء تک تدریس و تحقیق کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ حیدر آباد دکن برطانوی ہند کی سب سے بڑی ریاست تھی اس کی آبادی ایک کروڑ ساٹھ لاکھ اور رقبہ ۸۲ ہزار مربع میل تھا اس کی سالانہ آمدنی ۲۶ کروڑ روپے تھی، اس کی اپنی کرنسی اور ڈاک ٹکٹ تھے، اپنے مالی وسائل کی وجہ سے یہ ریاست ایک آزاد ملک بننے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ چنانچہ نظام حیدر آباد دکن نے ریاست کو ایک آزاد و خود مختار ریاست کے طور پر قائم رکھنے کا فیصلہ کیا۔ دوسری طرف بھارتی حکومت نے اپنے اثر و رسوخ سے کام لیتے ہوئے نظام پر دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ وہ اپنا الحاق بھارت سے کرے۔ بھارت کو اس کے مذموم عزائم سے باز رکھنے کے لئے نظام نے ۱۹۴۸ء میں ایک وفد ترتیب دیا جو مسئلہ الحاق کو اقوام متحدہ میں پیش کر کے ریاست کے موقف کی وضاحت کرے۔ اس وفد میں ڈاکٹر حمید اللہ بھی شامل تھے۔ ابھی یہ وفد فرانس ہی میں تھا کہ بھارت نے ریاست حیدر آباد پر ۱۷ ستمبر ۱۹۴۸ء کو بزور قوت قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد کبھی مقبوضہ حیدر آباد تشریف نہ لائے اور نہ ہی کبھی برطانیہ گئے۔

* گورنمنٹ کالج آف کامرس پیپلز کالونی گوجرانوالہ

پروفیسر خورشید احمد کے استفسار پر فرمایا: ''میں اس انگلستان کی سرزمین پر قدم نہیں رکھنا چاہتا جس نے میرے آزاد ملک کو بھارت کی غلامی میں دے دیا''

یوں آپ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۹۶ء تک پیرس میں مقیم رہے۔ ۱۹۴۹ء، ۱۹۵۰ء میں پاکستان آئے اور ''بورڈ تعلیماتِ اسلام'' اور قرارداد مقاصد کی تیاری کے سلسلہ میں ایک سال قیام کیا۔

دوبارہ صدر ضیاء الحق کی درخواست پر ۱۹۸۰ء میں بہاولپور آئے اور اپنے مشہور ''خطبات بہاولپور'' ارشاد فرمائے۔ جون ۱۹۸۷ء میں ایک بار پھر صدر پاکستان کی درخواست پر ہجرت کانفرنس اسلام آباد میں شرکت کے لئے پاکستان آئے۔ اپریل ۱۹۹۲ء میں آخری بار پاکستان آئے اور چند روز قیام فرمایا۔ ۱۹۹۶ء میں علیل ہو کر امریکہ منتقل ہوئے اور ریاست فلوریڈا کے شہر جیکسن ویل میں انتقال کر گئے۔ آپ کی حیات و خدمات پر بہت زیادہ لکھا گیا۔ اخبارات نے اداریے اور مضامین شائع کئے۔ رسائل و جرائد نے خصوصی نمبر نکالے۔ ان اشاعتوں میں ایک قابلِ ذکر کاوش ماہنامہ ''فکر و نظر'' اسلام آباد کی خصوصی اشاعت ہے۔ ۶۱۳ صفحات پر مشتمل یہ ایک ضخیم نمبر ہے۔ جس میں شخصیت، جہاتِ علمیہ، مکاتیب، منتخب نگارشات اور مطبوعات و مقالات کے عنوانات کے ذیل میں 26 چھبیس مقالات و مضامین ہیں۔ مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری، پروفیسر خورشید احمد، پروفیسر ڈاکٹر نثار احمد، ڈاکٹر محمود احمد غازی، پروفیسر ڈاکٹر صلاح الدین ثانی، ڈاکٹر خالد علویؒ، ڈاکٹر قاری محمد طاہر، ڈاکٹر محمد طاہر منصوری، ڈاکٹر محمد عبداللہ، حافظ محمد سجاد اور ڈاکٹر خورشید رضوی جیسے نابغہ شامل ہیں۔ روزنامہ نوائے وقت، جنگ، پاکستان اور اسلام نے شاہ بلیغ الدین، مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی، ارشاد احمد عارف، ہارون رشید، خورشید ندیم، سجاد میر، ڈاکٹر امین اللہ وثیر، ڈاکٹر محمود الحسن عارف، ڈاکٹر طاہر مسعود اور مولانا زاہد الراشدی کے مضامین قلمبند کئے۔ دینی و علمی رسائل و جرائد میں الحق، الشریعہ، گلوبل نور، لولاک اور تکبیر کے علاوہ ممکن نہیں کہ فکر و نظر اور ترجمان کے حلقے کے لوگوں نے اپنے جرائد میں اظہار خیال نہ کیا ہو۔ کیونکہ یہ ایک علمی اور اخلاقی ذمہ داری تھی جو ان عظیم لوگوں نے نبھائی کیونکہ یہ وہ لوگ تھے جن سے مرحوم کو ملاقات رہی، خط و کتابت رہی، ایک علمی و قلبی تعلق رہا یا پھر یوں کہیے کہ ان حضرات کو آپ کی علمی سرپرستی، رہنمائی اور حوصلہ افزائی حاصل رہی۔ علاوہ ازیں کچھ قابل ذکر لوگ ایسے بھی ہیں جن کا تذکرہ ڈاکٹر حمید اللہ کی علمی زندگی کے حوالہ سے ناگزیر ہے۔ ان میں مولانا ظفر اللہ انصاریؒ، سید سلیمان ندویؒ، مولانا مفتی محمد شفیع اور مناظر احسن گیلانی خاص قابل ذکر ہیں۔ ان حضرات سے ملاقاتیں رہیں۔ عقیدت و استفادہ کا تعلق قائم رہا۔ اور استاد و شاگرد کا تعلق اور احترام بھی۔ مناسب ہوگا کہ اس سال کے آخر میں ان حضرات کا تذکرہ کیا جائے جن کو موصوف سے ایک خاص علمی تعلق رہا۔ شاہ بلیغ الدین کو بھی آپ سے علمی و فکری نسبت رہی۔ خط و کتابت رہی، آپ حمید اللہ فیملی کے ایک فرد تصور ہوتے ہیں اس اجمال کی تفصیل شاہ صاحب کی زبانی ملاحظہ فرمائیں۔

''کچھ فرزندان جامعہ (عثمانیہ) ایسے تھے جو دور سے پہنچانے جائے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک ہی سانچے میں ڈھال کر پیدا کیا ہے۔ یہ ڈاکٹر غلام غوث ہیں' وہ محمد فاروق ہیں' یہ شرف الدین صاحب ہیں' اور وہ ڈاکٹر یوسف الدین' مولوی نصیر الدین ہاشمی' یونیورسٹی میں تو نہیں پڑھے لیکن تھے وہ بھی انہیں میں سے کسی منچلے نے اس زمانے میں اس برادری کو کرین فیملی (Crane Family) کا نام دیا' لیکن ہم لوگوں کے آتے آتے اس میں تقدیس کا رنگ پیدا ہو گیا تھا۔ ہم لوگ انہیں ڈاکٹر حمید اللہ فیملی کہنے لگے تھے۔ یہ سب اپنی دینداری' شرافت اور عملی رجحانات میں ایک جیسے تھے۔''

شاہ بلیغ الدین سے آپ کی خط و کتابت رہی' شاہ صاحب نے اپنی کتاب کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کی رائے جاننا چاہی تو جواب میں تحریر فرمایا: ''آپ کا گلہ درست ہے لیکن گزشتہ جون سے بیماریوں میں وقت گزرا آپ کی کتاب انبار میں گم ہے اور پڑھنے کا فی الوقت امکان نہیں ہے۔ میں وہ نہیں ہوں جو چالیس سال پہلے تھا۔ بوڑھا اور تھکا ہوا انسان ہوں۔ آپ کی لکھی ہوئی کتاب ہے اچھی ہونی چاہیے۔ خدا برکت دے۔''

یہ ایک طویل خط ہے جس میں ڈاکٹر صاحب نے اپنی کنیت' ترجمۃ القرآن اور سیرت نبویہؐ کے علاوہ شاہ صاحب کی طرف سے اٹھائے گئے سوالات کے جوابات دیئے ہیں۔ دوسرا خط پیرس سے لکھا جس پر ۱۹/۷/۸۹ کی مورخہ ثبت ہے۔ یہ خط بھی خالص علمی اور تحقیقی مواد پر مامور ہے۔ ان مکتوبات سے ان حضرات کے باہمی استفادہ اور احترام کا اندازہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی وفات پر شاہ صاحب نے جو مضامین تحریر کئے ان سے بھی آپ کے روابط پر روشنی پڑتی ہے۔

ہمدرد فاؤنڈیشن' کراچی کے بانی' سابق گورنر سندھ' معروف ماہر تعلیم' مذہبی دانشور' حکیم محمد سعید مرحوم سے بھی آپ کے خصوصی مراسم تھے۔ حکیم شہید سعید اپنے مقالہ ''ڈاکٹر حمید اللہ.....تاثرات'' میں فرماتے ہیں:

''ڈاکٹر محمد حمید اللہ ان علمائے اسلام میں سے ہیں جن سے میرا علمی و قلبی رابطہ تسلسل کے ساتھ قائم ہے اور میں ان کے مطالعہ کی وسعت اور علم و خدمات کا معترف اور قدر شناس ہوں''

شہید حکیم ایک سچے اور مخلص انسان تھے آپ کی دعوت پر ڈاکٹر صاحب مدینۃ الحکمۃ تشریف لائے اور ہمدرد یونیورسٹی کے آڈیٹوریم میں خطاب کے لئے کھڑے ہوئے تو آپ نے ان کیلئے تعارفی کلمات کہتے ہوئے فرمایا:

''ڈاکٹر محمد حمید اللہ عالم ہیں۔ نیز فرمایا کہ میں سمجھتا ہوں کہ میرے تاثر کے اظہار کے لئے اس سے زیادہ جامع الفاظ کوئی اور نہیں ہو سکتے۔''

ڈاکٹر صاحب نے بھی اپنے خطوط میں حکیم صاحب کا تذکرہ کیا ہے' جب آپ سندھ کے گورنر بنے تو مظہر قریشی صاحب کو ایک خط میں لکھا: ''حیرت سے پڑھا کہ حکیم محمد سعید صاحب سندھ کے گورنر بنے ہیں' اللہ مبارک فرمائے''

آپ ہی کے نام ایک دوسرے خط محررہ ۱۹۹۴/۱/۵ میں لکھا ہے:

''میں حکیم محمد سعید صاحب کی بہت عزت کرتا ہوں لیکن مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے کہ مجھ پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھائیں۔''

اس کے علاوہ ہمدرد فاؤنڈیشن کے حوالہ سے بھی متعدد خطوط میں آپ کا تذکرہ ملتا ہے۔ فاؤنڈیشن سے ڈاکٹر صاحب کی دلچسپی کا ذکر شاہ بلیغ الدین نے بھی کیا ہے۔ حکیم شہید نے اپنی زندگی میں ڈاکٹر موصوف کی جملہ کتب کو جمع کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ اور چند کتب کے فوٹو بھی حاصل کر لئے تھے۔ ہمدرد فاؤنڈیشن کے ذمہ داروں کو واجب ہے کہ بانی فاؤنڈیشن کے ادھورے کام کو پورا کریں۔

مفتی تقی عثمانی صاحب مدیر ماہنامہ ''البلاغ'' کراچی' نائب مدیر دارالعلوم کراچی' سابق جج شریعت ایپلٹ بینچ سپریم کورٹ آف پاکستان کو بھی آپ سے علمی و قلمی تعلق رہا۔ ڈاکٹر صاحب کو بھی آپ کے خط کا انتظار رہتا۔ ۶ر دسمبر ۱۹۹۴ء کو مظہر قریشی صاحب کو خط لکھا۔ ''جسٹس محمد تقی عثمانی کی طرف سے بہت دن ہوئے کوئی خط نہیں آیا''

مفتی صاحب نے ڈاکٹر صاحب کو مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی کتاب ''اظہار الحق'' کا نسخہ ارسال فرمایا تو اس کا ذکر بھی ایک خط میں کیا: ''محترم تقی صاحب کے پاس سے کتاب ''اظہار الحق'' (اردو) کا تین جلدوں والا نسخہ بھی آیا ہے۔ میں نے انہیں رسید بھیجی ہے۔ آپ بھی احتیاطاً ان سے دریافت کر لیں۔ البتہ ان کی کتاب تکملہ احادیث سے واقف نہیں ہوں۔ خدا مبارک کرے''

مولانا عثمانی نے مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی کتاب ''اظہار الحق'' (عربی) کا ترجمہ کرا کر خود اس پر ایک محققانہ مقدمہ تحریر کیا ہے۔ مولانا کیرانوی کی یہ کتاب پوری دنیا میں اسلام کے دفاع اور عیسائیت کے بارے میں ایک بلند مقام رکھتی ہے اور متعدد زبانوں میں اس کے تراجم ملتے ہیں۔ اسی کتاب کا فرانسیسی نسخہ ڈاکٹر حمید اللہ نے مولانا مفتی تقی عثمانی کو ارسال کیا جس کا ذکر اپنے ایک خط میں یوں کیا ہے۔

''ایک زحمت دینے کی جسارت کرتا ہوں' میں نے محترم جسٹس تقی عثمانی کو ایک فرانسیسی کتاب ''اظہار الحق'' مولفہ رحمت اللہ دہلوی (کیرانوی) ہوائی ڈاک کے ذریعے بھیجی ہے۔ کیا وہ انہیں پہنچی یا نہیں؟ سنا ہے اس فرانسیسی کتاب کا انگریزی ترجمہ بھی ہے (گزشتہ صدی میں) تلاش کر رہا ہوں''

جناب مظہر قریشی کے نام ان خطوط میں مولانا عثمانی کا ذکر ملتا ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات میں مکاتیب رہی ہوگی۔ ان حضرات میں علمی رابطہ کی ایک صورت ''البلاغ'' بھی رہا جس میں ڈاکٹر صاحب کے مقالات شائع ہوتے رہے۔ شیخ راشد صاحب نے ان مقالات کی ایک فہرست بھی مرتب کی ہے جو اس موقر جریدہ میں شائع ہوئے۔

ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ سابقہ نائب صدر انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی' اسلام آباد سے بھی آپ کا تبادلہ خیال رہا'

ادارہ تحقیقات اسلامی نے آپ کی وفات پر ایک تعزیتی ریفرنس کا انعقاد کیا جس میں ڈاکٹر غازی نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔ ''بہت سے دینی اور تحقیق طلب امور میں وقتاً فوقتاً مجھے بھی ان سے تبادلہ خیال کا اتفاق ہوا''

بعدازاں آپ کا یہ خطاب ماہنامہ ''دعوۃ'' اسلام آباد کی خصوصی اشاعت میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ بیسویں صدی کے ممتاز ترین محقق کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس مضمون سے ان دانشوروں کے باہمی روابط کا بہ آسانی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ مظہر قریشی صاحب کے نام ایک خط میں فرمایا:

''کتاب الروی الواقدی کی تنقید جو محترم ڈاکٹر غازی صاحب نے فرمائی ہے وہ سمندری ڈاک سے ممکن ہے۔ دو ماہ بعد ملے۔ ان کی تردید مجھ سے نہ کروایئے۔ میرے پاس اس کا وقت نہیں ہے۔ میں نے مقدمے میں ساری دلائل لکھ دی ہیں اور خلاصہ یہ ہے کہ واقعہ شاہدا تنا بدنہیں ہے جتنا بدنام ہے۔ ان کی کتابوں میں مجھے کبھی کوئی چیز نہ ملی جو اسلام یا رسول اللہ کی توہین پر مشتمل ہو۔''

اور جب ڈاکٹر غازی صاحب کا تبصرہ انہیں موصول ہوا تو اس پر یوں اظہار خیال فرمایا:

''ڈاکٹر غازی صاحب نے میری شائع کردہ واقدی کی کتاب پر جو تبصرہ کیا ہے۔ اس میں ایک اعتراض درست ہے کہ میں نے اصل مخطوطے کا مفصل ذکر نہیں کیا اگر چھپنے سے پہلے بات بتائی جاتی یا ذہن میں آتی تو تلافی کرسکتا تھا۔ اب نئے ایڈیشن کا انتظار کرنا ہوگا۔ شاید وہ میرے مرنے کے بعد نکلے اس کے سوا اور کیا لکھوں''

ڈاکٹر صاحب جامع الکمالات تھے۔ لیکن ایک صفت میں وہ بہت متفرد تھے وہ صرف اہل علم ہی کا خاصہ رہا ہے۔ یعنی وسعت قلبی اور قبول حق کی صفت' جس کا تذکرہ مذکورہ بالا خط میں بھی ہوا ہے' اسی نوع کی ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیں۔ آپ نے ادارہ تحقیقات اسلامی' اسلام آباد کے سہ ماہی مجلہ الدراسات الاسلامیہ'' (عربی) کے محرم تا ربیع الاول ۱۴۱۰ھ کے شمارہ میں ایک مضمون لکھا جس میں یہ موقف اختیار کیا کہ آپ حضور ﷺ نے حقوق زوجیت کے ساتھ صرف چار کو باقی رکھا اور باقی پانچ بیویوں کو اعزازی حیثیت دے دی۔ ان کو حقوق زوجیت حاصل نہ تھے۔ ماہنامہ الشریعہ' گوجرانوالہ نے اس پر جرح کی اس کی تردید میں اکتوبر ۱۹۹۰ء کے شمارہ میں پروفیسر عبدالرحیم صاحب کا مضمون ''تعداد ازدواج'' شائع کیا۔ اس مضمون کے جواب میں ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے جو مضمون لکھا وہ الشریعہ کے شمارہ دسمبر ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا۔ مدیر رسالہ مولانا زاہد الراشدی صاحب ڈاکٹر صاحب کے اس جواب سے مطمئن نہ ہوئے اور اعلان کیا کہ ہم اس کا علمی و تحقیقی جواب دینے کا حق محفوظ رکھتے ہیں۔ غالباً آپ مولانا قاضی محمد ادریس خان ایوبی کا تحقیقی مضمون شائع کرنا چاہتے تھے۔ اسی دوران ماہنامہ صدائے اسلام' پشاور نے ڈاکٹر صاحب کے موقف پر اعتراض کیا۔ جس کے جواب میں ڈاکٹر صاحب نے مدیر رسالہ کے نام ایک مکتوب میں اپنے موقف سے رجوع کرلیا۔

ڈاکٹر صاحب کا یہی خط ''الشریعہ'' کے شمارہ مارچ ۱۹۹۱ء میں شائع ہوا۔ اسی خط سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

میری عمر پچاسی سال سے متجاوز ہوگئی کہ (محرم ۱۳۳۶ھ کی ولادت ہے) اس لئے یقیناً عقل بھی سٹھیا گئی ہے۔ ادارہ تحقیقات اسلامیہ میں نیک نیتی سے جو مضمون لکھا تھا وہ غلط ہوسکتا ہے کہ انسان ہوں' حق بات کا بول بالا ہوسکتا ہے انسانوں کا نہیں۔ آپ کے ناظرین میری نہیں اہل علم کے فیصلے کی تعظیم کریں..... اگر میرا مطالعہ ناقص اور میرا استنباط غلط ہے تو میں اللہ کے پاس معافی مانگتا ہوں' میں نے الدراسات الاسلامیہ میں عربی میں مضمون اسی لئے لکھا ہے کہ وہ عوام نہیں بلکہ اہل علم کے مطالعہ میں آتا ہے۔''

جناب خورشید ندیم نے تکبیر مسلسل میں لکھا تھا کہ ''ڈاکٹر صاحب اپنے دبستان کے واحد رکن ہیں اول بھی اور سرِ دست آخر بھی'' یہ سچ ہی کہا تھا اور اگر کوئی اس علمی و تحقیقی اسلوب کا دعویٰ دار ہے تو وہ دیکھے کہ ڈاکٹر صاحب کے علمی رویے' برداشت' قبول حق' عاجزی وانکساری اور زہد وفقر کا معیار کیا تھا۔ ہمارے یہاں کی جملہ دینی نسبتوں اور علمی دبستانوں میں آج کوئی ایک بھی ایسا ہے۔

؎ پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

مولانا سمیع الحق صاحب دارالعلوم حقانیہ' اکوڑہ خٹک اور اس کے علمی و دینی مجلّہ کے مہتمم و مدیر اعلیٰ ہیں۔ اس مجلّہ میں ڈاکٹر صاحب کے درجنوں خطوط شائع ہوئے۔ جناب راشد الحق سمیع صاحب کا فرمان ہے کہ خطوط ان کی فائل میں محفوظ ہیں۔ معارف اعظم گڑھ کے بعد شاید ''الحق'' ہی وہ مجلّہ ہے جس کے بارے میں ڈاکٹر صاحب نے اپنے اطمینان اظہار فرمایا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی عادت رہی کہ جب کسی رسالہ میں کوئی قابل ذکر بات شائع ہوتی تو خط کے ذریعے اس کے مدیر سے تبادلہ خیال کرتے۔ اپنے ایک خط میں ''الحق'' کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے۔

الحمدللہ الحق کا علمی معیار دن بدن' روز بروز بلند ہوتا جارہا ہے۔ اور اس میں ناظرین کے ہر طبقے کے لئے کچھ نہ کچھ دلچسپی کی چیزیں مل جاتی ہیں۔

پروفیسر خورشید احمد صاحب کو ڈاکٹر صاحب سے عقیدت واستفادہ کا بڑا طویل تعلق رہا۔ یہ تعلق چالیس کی خط وکتابت کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ یہاں آپ کے مضمون ''ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم'' سے ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے روابط کی نوعیت کیا تھی۔

پروفیسر صاحب فرماتے ہیں:

''ڈاکٹر محمد حمید اللہ سے میری ملاقات اس زمانے میں ہوئی جب میں ابھی طالب علم تھا اور اسلامی جمعیت طلباء میں سرگرم تھا۔ اور وہ پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی کو اسلامی دستور سازی میں مدد دینے کیلئے پاکستان آئے تھے۔ وہ مولانا سید سلمان ندوی' مفتی محمد شفیع اور مولانا ظفر احمد انصاری کے ساتھ مجلس تعلیمات اسلامی کے رکن تھے اور اسمبلی کی عمارت ہی کے ایک حصے میں انکا دفتر تھا..... ''چراغ راہ'' کے اسلامی قانون نمبر کی اشاعت پر بہت خوش تھے اور

بالکل غیر متوقع طور پر تین صفحے کا خط لکھا جس میں کتابت کی غلطیوں کی نشاندہی کی.....ڈاکٹر صاحب سے خط و کتابت کا یہ سلسلہ چالیس سال پر پھیلا ہوا ہے' مگر کس دل سے کہوں کہ اس کا بیشتر حصہ محفوظ نہ رہ سکا۔ آخری خط میری مختصر کتاب ''فیملی لائف آف اسلام'' کے فرانسیسی ترجمے پر ان کی تصحیح وتنقید سے عبارت تھا''

پروفیسر صاحب اپنے اسی مضمون میں آگے چل کر مزید لکھتے ہیں: ''میں نے ڈاکٹر صاحب سے متعدد علمی مذاکرات میں شرکت کی۔ لیکن سب سے زیادہ یادگار وہ ضخیم (تربیتی کیمپ) تھا جو فرانس میں ایک دیہاتی علاقے میں فرانس کے مسلمان طلباء کی اسلامی تنظیم (UMSO) کے تحت منعقد ہوا تھا' اور جس میں پانچ دن رات ہم نے ساتھ گزارے۔ ڈاکٹر صاحب بھی عام طلبہ کی طرح زمین پر سوتے اور اپنے برتن اپنے ہاتھ سے دھوتے تھے۔ مجھے یہ سعادت بھی حاصل ہوئی کہ کمال التفات سے ڈاکٹر صاحب نے میری تقاریر کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ فرمایا''

پروفیسر خورشید احمد ہمارے ملک کے دھیمے مزاج کے منفرد سیاست دان کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ ماہر اقتصادیات ہیں اور علمی حلقوں میں آپ کی ایک اور پہچان ''ترجمان القرآن'' ہے جو ملک کی ایک منظم دینی وسیاسی جماعت کا ترجمان رسالہ ہے۔ ان کے محولہ بالا اقتباسات سے جہاں یہ واضح ہوتا ہے کہ پروفیسر خورشید صاحب کو ڈاکٹر صاحب سے عقیدت واحترام اور اخذ واستفادہ کا تعلق رہا۔ وہاں ڈاکٹر صاحب کی علم دوستی' عاجزی وانکساری جو خاکساری کی حد تک پہنچی ہوئی تھی اس کا ایک ثبوت اور فراہم ہوتا ہے' فی زمانہ علماء ودانشور اور حضرات میں یہ صفت مفقود نظر آتی ہے۔ اور یہ بات جماعت اسلامی کے دانشوروں کے بارے میں خصوصیت سے کہی جاسکتی ہے۔

بیسویں صدی کے فکری ارتقاء کے تناظر میں علامہ محمد اقبال' مولانا اشرف علی تھانوی' مولانا سید سلمان ندوی' سید ابوالحسن ندوی' ڈاکٹر محمد حمید اللہ اور سید ابوالاعلی مودودی بڑے بڑے نام لئے جاسکتے ہیں' تاہم مؤخر الذکر کئی اعتبار سے منفرد اور ممتاز مودودی' مفکر' مصلح اور مدبر میں اپنے تاثر کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

''جب اسلامی فکریات کے وسیع ذخیرے کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بیسویں صدی کی اسلامی فکر پر سب سے زیادہ جس شخص نے نہایت گہرے اثرات مرتب کئے وہ مولانا مودودی ہیں۔ ان کی اثر پذیری اپنی وسعت اور عمق کے اعتبار سے اور اپنی اصابت فکر اور اپنے اثرات کے اعتبار سے منفرد مقام حاصل ہے۔''

مولانا مودودی نے اپنے تفکر کی بنیاد قرآن پر رکھی۔ ان کا مشہور جملہ ہے۔ ''مسلمانو! قرآن کی دعوت لے کر اٹھو اور پوری دنیا پر چھا جاؤ۔''

آپ نے قرآن کے آفاقی پیغام کو عام کرنے کے لئے تفہیم القرآن کے نام سے جدید دور کی شہرہ آفاق تفسیر لکھی۔ ڈاکٹر حمید اللہ بھی اس تفسیر سے مستفید ہوئے اور جہاں کہیں اشکال ہوتا خطوط کے ذریعے برملا اظہار کرتے۔ ایک خط میں ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری (پسر مولانا ظفر احمد انصاری) کو خط میں لکھا ''معاف فرمائیں آپ کے

کاموں میں حارج ہو رہا ہوں۔ آپ غالباً تفہیم القرآن (مولفہ مولانا مودودی مرحوم) کا انگریزی ترجمہ کر رہے ہیں۔ ان میں تین فاش غلطیاں ملیں ہیں۔ مناسب ہو تو اس کی سہو کی تلافی فرمادیں"

ڈاکٹر صاحب مولانا مودودی کو ایک حق پسند انسان سمجھتے تھے۔ مولانا سمیع الحق کے نام ایک خط میں فرماتے ہیں:

" جو اقتباسات انہوں نے اپنے ہم رائے لوگوں سے نقل کئے ہیں۔ وہ سب کے سب اسرائیلیات سے ماخوذ ہیں۔ کوئی بھی خدا اور رسول سے استسنا نہیں ہے۔ مولانا مودودی مرحوم زندہ ہوتے تو میں ان سے ان کا ماخذ پوچھتا۔ وہ حق پسند تھے اور اپنی غلطیوں کو مان لیتے تھے۔ متعدد تحریروں میں سے ایک کا ذکر کرتا ہوں۔ تفہیم القرآن ج ۴ ص ۱۱۶ میں ام المومنین حضرت جویریہؓ کو یہودی خاندان سے بتایا ہے۔ وہ بنی المصطلق یعنی خزاعہ کی شخصیت عرب تھی۔ میرے استفسار پر مرحوم نے وعدہ کیا تھا کہ آئندہ ایڈیشن میں اصلاح کردی جائے گی۔"

ڈاکٹر انصاری کے نام خط میں بھی اس سہو کی طرف توجہ دلائی تھی۔ جولائی ۱۹۸۹ء کے ایڈیشن میں اس غلطی کی اصلاح کردی گئی۔ ان خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب اور مولانا مودودی میں باہم تبادلہ خیال ہوتا رہتا تھا۔

ڈاکٹر حمید اللہ کے حوالہ سے یہاں ایک اور علمی و مذہبی اور سیاسی شخصیت کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

مولانا ظفر احمد انصاری (والد ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری) ۱۹۰۸ء میں آلہ آباد بھارت میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۰ء میں آلہ آباد یونیورسٹی سے بی اے ۱۹۳۱ء اور فلسفہ میں ایم اے کا امتحان ۱۹۳۳ء میں پاس کیا۔ ایل ایل بی کرنے کے بعد آلہ آباد اور دہلی میں سرکاری ملازمت اختیار کی۔ ۱۹۴۲ء میں نوابزادہ لیاقت علی خان کی وساطت سے مسلم لیگ میں آئے اور قیام پاکستان تک مختلف حیثیتوں سے کام کرتے رہے۔ قیام پاکستان کے بعد اپنی مساعی جمیلہ استحکام پاکستان اور نفاذ اسلام کے لئے وقف کردی۔ اسی سلسلہ میں علامہ شبیر احمد عثمانی، مولانا مفتی محمد شفیع اور ڈاکٹر حمید اللہ سے تعلق اور رابطہ قائم ہوا۔ جو عمر کے آخری سانس تک قائم رہا۔ آپ کے بعد آپ کے فرزند ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری نے اس تعلق کو خوب نبھایا کہ ڈاکٹر صاحب کی وفات پر ماہنامہ فکر و نظر کی ایک خصوصی اشاعت کا اہتمام کیا جو کئی زاویوں سے ایک مثالی اور حوالہ جاتی دستاویز کہی جاسکتی ہے۔ آپ نے اس کے آغاز ہی میں ڈاکٹر صاحب کے بارے میں اپنے مشاہدات اور تاثرات بیان کئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر موصوف کے انصاری فیملی سے گہرے علمی روابط رہے۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد (۱۹۴۸ء) ہی میں بعض ارباب علم و دانش کو یہ فکر لاحق رہی ہے کہ کسی طرح مملکت خداداد کو اس کی نظریاتی بنیادوں پر استوار کیا جائے۔

اس ضمن میں جو اولین کاوش نظر آتی ہے اس میں تین نام بڑے معتبر ہیں۔ مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا احتشام الحق تھانوی اور مولانا ظفر احمد انصاری۔ ان حضرات کی تحریک پر مولانا مناظر احسن گیلانی، ڈاکٹر محمد حمید اللہ، مولانا احتشام الحسن صاحب کاندھلوی اور جناب غلام دستگیر رشید اپریل ۱۹۴۸ء میں کراچی میں جمع ہوئے۔ دو ہفتے تک

مشاورت جاری رہی۔ اس دوران تمام میٹنگز مکمل پر طور غیر سرکاری تھیں۔ اور مولانا انصاری ان علمی مجالس کے غیر سرکاری میزبان۔ بعدازاں بورڈ تعلیمات اسلامی (۱۹۴۹ء۔۱۹۵۰ء) عمل میں آیا تو ڈاکٹر حمید اللہ' مولانا مفتی محمد شفیع' پروفیسر عبدالخالق' مفتی جعفر حسین مجتہد بورڈ کے ممبر' سید سلمان ندوی چیئرمین اور مولانا انصاری سیکرٹری مقرر ہوئے۔ یہ بورڈ حکومت نے تشکیل دیا اور اس کا کام اسلامی آئین کی تشکیل میں دستور ساز اسمبلی کی معاونت کرنا تھا چونکہ دستور ساز اسمبلی کے لئے ان شعار پر عمل کرنا لازمی نہیں تھا اس لئے بورڈ کی حیثیت ایک مشاورتی کونسل کی سی تھی۔ اس لئے بظاہر اس کے اثرات نظر نہ آئے لیکن درحقیقت آئینی تاریخ میں ان مجالس اور بورڈ تعلیمات اسلامیہ کو کلیدی حیثیت رہی ہے۔ ۱۹۳۱ء میں ۲۲ نکات پر مختلف مکاتیب فکر کے علماء کا متفق ہوجانا ایک ایسی پیش رفت تھی جس کے پس منظر میں علامہ شبیر احمد عثمانی اور مولانا ظفر احمد عثمانی جیسے لوگوں کا خلوص کارفرما تھا۔ قرارداد مقاصد کے متن کی تیاری اور اسمبلی میں اس کی منظور کے لئے بھی ان حضرات کی مساعی قابل ذکر ہیں۔ مولانا انصاری اس سلسلہ میں رقمطراز ہیں:

'' .....دستور ساز اسمبلی میں مولانا شبیر احمد عثمانی اسلامی گروہ کی قیادت کررہے تھے۔ سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ اگر اسلام پسند طبقے نے غیر معمولی دانشمندی اور بصیرت سے کام نہ لیا تو دوسرا گروہ عیارانہ چالوں سے کامیاب ہوجائے گا۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ قرارداد مقاصد کا ایک ایک لفظ اس طرح تیار کیا جائے کہ دوسرا گروہ متوحش نہ ہو لیکن وہ اپنے معانی اور وسعت کے اعتبار سے اسلام کی ترجمانی کرتا ہو۔ بعض اوقات ہم نے ایک مناسب فقرے اور ایک ایک موزوں لفظ کی تلاش میں کئی کئی راتیں مسلسل سوچ بچار کیا ہے۔ پھر جب کوئی مخالف گروہ وار کرتا ہے تو اس سے بچاؤ کی تدابیر سوچنی پڑتی ہیں۔''

پاکستان کے تمام دستاویز کی تدوین وتوید میں آپ نے فعال کردار ادا کیا۔ ۱۹۷۷ء۔۱۹۸۹ء تک اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن رہے۔ اس حیثیت سے بھی ملک کے قوانین کو اسلامی اصولوں میں ڈھالنے کے لئے بھی آپ نے اہم کردار ادا کیا۔ ملک سے باہر بھی آپ کی شہرت ایک عالمی اسلامی رہنما کی تھی' اسلامک سینٹر جینوا کے چیئرمین کے طور پر بھی کام کیا۔ علاوہ ازیں امریکہ اور یورپ میں بھی بعض اہم سنٹرز کے نگران رہے اور اس دوران مولانا انصاری اور ڈاکٹر حمید اللہ کا مسلسل رابطہ رہا۔ انصاری صاحب نے سابق وزیراعظم پاکستان ذوالفقار علی بھٹو کو مشورہ دیا کہ ڈاکٹر صاحب کی صلاحیتوں سے بھرپور فائدہ اٹھایا جائے۔ بھٹو صاحب نے آپ سے اتفاق کیا لیکن اس سلسلہ میں کوئی عملی پیش رفت کے لئے ان کے پاس کوئی وقت نہ تھا۔ ڈاکٹر حمید اللہ مولانا انصاری کی ملی خدمات کے ہمیشہ معترف رہے۔ مولانا صلاح الدین (مدیر تکبیر) جنوری ۱۹۹۲ء میں پیرس گئے تو آپ کی رہائش پر ملاقات کے لئے حاضر ہوئے۔ بات آگے بڑھی تو فرمایا:

'' میں ۱۹۴۸ء سے یہاں مقیم ہوں۔ پاکستان یہیں سے گیا تھا اور وہاں مولانا سید سلمان ندوی' متعدد علماء

اور مولانا ظفر احمد انصاری سے مل کر پاکستان کے آئین کے لئے بنیادی نکات' علماء کے بائیس نکات اور نظام تعلیم کے خاکہ کی تیاری میں شریک رہا اور پھر پیرس چلا آیا۔ انہیں میری (مولانا صلاح) زبانی مولانا انصاری کی وفات کی خبر ملی تو گہرے دکھ کا اظہار کیا مولانا کی ملی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے ان کی مغفرت کیلئے دعا کی۔'' یہ ساری گفتگو ۱۵ر جنوری ۱۹۹۲ء کو ہوئی جس میں روزنامہ عبرت' حیدرآباد کے ایڈیٹر قاضی اسد عابد اور روزنامہ فرنٹیئر پوسٹ کے ایڈیٹر جناب قیصر بٹ نے بھی شرکت کی' بعدازاں اسے تکبیر نے رپورٹ کیا۔

مرحوم لیاقت علی خان نے جو اسلامی بورڈ تشکیل دیا تھا' اس کے ایک اہم رکن مولانا مفتی شفیع بھی تھے' آپ دارالعلوم دیوبند کے صدر مفتی رہے۔ ستائیس ہزار طلباء نے آپ سے تلمذ کا شرف حاصل کیا۔ آپ کی علمی کتب کی تعداد 162 تک پہنچتی ہے۔ جس میں آپ کی معروف تفسیر ''معارف القرآن'' بھی ہے جو آٹھ جلدوں میں دور حاضر کی جدید فقہی تفسیر کہی جاسکتی ہے۔ کراچی میں ایک دینی مدرسہ کی بنیاد رکھی۔ اور ماہنامہ ''البلاغ'' کا اجراء کیا۔ اس مستند دینی جریدے میں ڈاکٹر حمید اللہ کے متعدد مضامین اور خطوط شائع ہوئے۔ چونکہ اسلامی بورڈ اور قرارداد مقاصد کی تیاری میں ڈاکٹر حمید اللہ بھی شریک رہے اس لئے اسی فورم پر ان حضرات کی پہلی ملاقات اور تعارف ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس ملاقات کے بارے میں بتایا:

''میں اسے اپنی بدقسمتی سمجھتا ہوں کہ فاضل گراں مایہ' فخر عصر' محمد شفیع عثمانی مرحوم اعلی اللہ مقامہ سے زیادہ استفادہ کا موقع نہ پاسکا۔ حیدرآباد دکن میں ولادت اور بے وطنی سے قبل کی تقریباً ساری عمر وہیں گزرنے کے باعث اگر مرحوم سے ملاقات بالکل ہی نہ ہوتی تو بھی باعث حیرت نہ ہوتا۔ لیکن خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ خزانے اس کا موقع دیا۔ پاریس میں قیام پذیر تھا کہ یکا یک آب و دانہ ۱۹۴۹ء میں کشاں کشاں کراچی لے گیا۔ وہاں پورا ایک سال رہنا ہوا مجلس دستور ساز میں ایک مشاورتی (فنی) مجلس تعلیمات اسلامی قائم کی گئی تو مقامی علماء میں سے حضرت مفتی محمد شفیع منتخب ہوئے اور اس سے بہتر کوئی انتخاب ہو نہیں سکتا تھا۔ ذمہ داران اعلیٰ مقام نے نہ معلوم کس غلط فہمی میں اس ناکارے کو بھی اس میں داخل کیا۔ اس طرح مرحوم سے ملاقات کی صورت ہوگی۔''

اپنے ایک سال کے قیام کے دوران ڈاکٹر صاحب تعطیلات کے علاوہ ہر روز ان سے ملاقات کرتے۔ علمی مسائل پر بات ہوتی' ڈاکٹر صاحب مولانا کی علمی وجاہت' وسعت نظری اور تواضع جیسی صفات سے بہت متاثر ہوئے۔ مفتی صاحب کی وفات پر آپ نے جو مضمون ''البلاغ'' کے لئے تصنیف کیا اس کے آغاز میں اپنے تاثرات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔

''اپنی سرکاری مصروفیت سے مجھے یہاں بحث نہیں تعطیلات کو چھوڑ کر حضرت مفتی صاحب سے ہر روز ملاقات ہوتی رہی۔ وقتاً فوقتاً علمی مسائل پر تبادلہ خیال بھی ناگزیر تھا۔ ان کے عمیق علمی اور وسعت نظری کو آدمی دور سے

تحریروں کو پڑھ کر بھی جان سکتا اور سراہا سکتا تھا' جو چیزیں دور سے نہیں بلکہ صرف قریبی اور طویل تماس میں ہی نظر آ سکتی ہیں' ان میں اولاً تواضع کی اسلامی صفت ہے' کیونکہ نہ ہو شاخ بے ثمر سر اٹھائے اکڑتی رہتی ہے۔ تو میوہ دار شاخ کا سر روز افزوں جھکتا ہی جاتا ہے۔ عالم میں انانیت' غرور اور تکبر کی جگہ تواضع ہو تو اس کی عزت گھٹتی نہیں بڑھ جاتی ہے۔ دوسری صفت جس سے میں ہمیشہ متاثر ہوتا رہا' وہ ان کی وسعت قلبی تھی کہ چھوٹوں سے بھی کچھ سیکھنے میں کبھی خفیف ترین تذبذب نہ ہو۔ وہ بڑے فقیہ اور مستند مفتی تھے۔

ڈاکٹر صاحب کی خواہش تھی کہ کراچی میں بھی کوئی ایسا بلند معیار اور علمی مدرسہ قائم کیا جائے جسے ''دیوبند ثانی'' کہا جا سکے۔ مولانا مفتی صاحب آپ کے اس خیال سے متفق تھے۔ کوئی حجاب تھا تو بس یہ کہ کیا طلباء ملیں گے۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے کہا ''دیوبند جیسے ایثار طلب اور ترک دنیا کرنے والے مدرسے میں جانے والے لوگ ہمالیہ تلے کے براعظم میں کم نہ تھا''

ڈاکٹر صاحب کا بیان ہے کہ اس پر آپ مطمئن ہو گئے' اور آپ نے مجوزہ دارالعلوم کے قیام کا عزم کر لیا۔ آج یہ وہی مدرسہ جو چھپن ایکڑ اراضی پر قائم دارالعلوم کراچی کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہے۔ مفتی صاحب کا اندازِ فکر نرالہ اور نادر و شاذ تھا۔ روایتی علماء کے برعکس نئی چیزوں سے گھبرا کر فوراً بدعت کا گمان کرنے کی بجائے ان کی حکمت میں تفکر کرتے تھے۔ ڈاکٹر نے آپ کی جدید فقہی کی خدمات کے تناظر آپ کی چند تصانیف کا ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

''مرحوم و مغفور نہ صرف بڑے عالم تھے بلکہ اچھے ادیب بھی تھے۔ ایک تو ان کی کتاب ''معارف القرآن'' ہے جو اچھی مصری تفسیر ہے۔ اسی طرح ان کا مختصر مضمون ''اسلامی ذبیحہ'' معلومات کا گنجینہ ہے اور ''طعام اہل الکتاب'' کے متعلق بہت سی غلط فہمیوں کو دور کرتا ہے۔ ''اسلام کا نظام اراضی'' بھی ایک بہت مفید تالیف ہے۔ ان کے علاوہ بھی مرحوم کی بہ کثرت مطبوعہ تصنیفیں ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کے چند گراں مایہ مقالوں کا عربی ترجمہ ہو کر عرب ممالک کے علمی رسالوں میں شائع ہو تو مرحوم کی قدر و قیمت سے ایک وسیع تر حلقہ واقف ہو سکے گا''

علم' ایثار اور خلوص کا رشتہ بڑا عظیم رشتہ ہوتا ہے۔ جو ان دو حضرات کے درمیان آخری وقت تک موجود رہا۔ ڈاکٹر صاحب کی فرانس روانگی سے دو دن قبل مفتی صاحب ڈاکٹر صاحب کی رہائش گاہ پر ملنے گئے۔ آپ کی جدائی کا مفتی صاحب کو بڑا ملال تھا۔ گویا کسی عزیز قریب سے محروم ہو رہے ہیں۔ پچیس سال بعد ڈاکٹر صاحب جب دوبارہ کراچی تشریف لائے تو زیارت کیلئے حضرت مفتی صاحب کے یہاں حاضری دی۔ علالت کے باوجود جوشِ جذبات سے کھڑے ہو گئے اور گلے لگا لیا اور پھر ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کو جن حضرات سے علمی انسیت رہی ان میں ایک نام سید سلیمان ندوی بھی ہیں۔ اپنی ایک یاداشت میں ان کو پندرھویں صدی ہجری کا مجدد کہا ہے۔ ندوہ کو اپنے ہاں کے جن اساتذہ پر فخر ہونا چاہیے۔ ان

میں سید سلمان ندوی کا مقام بہت بلند ہے۔ یہ سید ندوی ہی تھے جنہوں نے دیوبند اور ندوہ ہندوستان کی عظیم درس گاہوں میں حائل خلیج کو بانٹنے میں اہم کردار ادا کیا۔ دارالمصنفین اور معارف آپ کی علمی یادگاریں ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اور مولانا ندوی میں بچپن سے وفات تک محبت' احترام' اور علم وادب کا تعلق موجود رہا۔ وہ خود فرماتے ہیں۔

مجھے سید صاحب مرحوم سے نادیدہ محبت تھی' یعنی ان کا بڑا احترام کرتا تھا۔ سنا ہے کہ انہیں بھی مجھ سے محبت تھی یعنی شفقت اور ذرہ نوازی' میں نے نوعمری ہی سے طالب علمانہ خط وکتابت شروع کی تھی۔ اور وہ ہمیشہ اور فوراً جواب سے نوازتے تھے۔ ''سنا ہے'' کے لفظ اسلئے استعمال کرتا ہوں کہ مجھے اس کا علم نہ تھا۔ اگر حال میں مولانا ابوعلی عبدالباری یہ بیان نہ فرماتے وہ ساٹھ باسٹھ سال سے دارالمصنفین اعظم گڑھ سے وابستہ رہے اور رسالہ معارف سے خاص تعلق رکھا ہے۔ معارف جو اردو زبان کا بہت معروف اور علمی رسالہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس ماہنامہ کو دنیا کا سب سے بلند پایہ رسالہ سمجھتے تھے۔ مدیر معارف کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

''معارف کی میرے دل میں بہت عزت ہے۔ وہ ہمارے تاریخ حال کا مستقبل میں ایک وثیقہ ایک ماخذ ہوگا۔''

ڈاکٹر صاحب کے سب سے زیادہ مقالات اسی رسالہ میں شائع ہوئے۔ فرماتے ہیں:

''رسالہ معارف میں کوئی مضمون امیدوار بن کر حاضر ہوتا تو بطور ایڈیٹر سید صاحب مرحوم اس ضروری ترمیم راصلاح کرتے۔ صرف دو آدمیوں کے مضمون اس سے مستثنیٰ تھے۔ ایک مرحوم مسعود عالم ندوی اور دوسرا یہ ناکارہ براہ جس کا جب کوئی مضمون معارف میں چھپنے کے لئے آتا تھا تو (سید صاحب) باغ باغ ہوجاتے تھے اور فوراً کتابت کے لئے کاتب کے حوالے کردیتے۔ ذرا بھی تاخیر کو راہ نہ دیتے تھے''

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ ان روابط کے باوجود سید صاحب سے ملاقات کم ہی رہی۔ موصوف کے اپنے مضامین میں دو ملاقاتوں کا ذکر کیا ہے۔ پہلی ملاقات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں ہوئی۔ جب آپ جامعہ کی دعوت پر لیکچر دینے آئے تھے اور دوسری بار کراچی میں یہ وہ زمانہ تھا جب ہر دو حضرات مجلسِ تعلیمات اسلامیہ کے سلسلے میں یہاں قیام پذیر تھے۔ اسی ملاقات میں جو شاید آخری بھی تھی مولانا ندوی نے خواہش ظاہر فرمائی کہ ڈاکٹر صاحب سیرت پر کوئی عمدہ کتاب تصنیف کریں' جب ڈاکٹر صاحب نے استفسار کیا ''رحمت عالم'' اور ''سیرت النبیؐ'' کے بعد کیا ضرورت ہے؟ تو فرمانے لگے ان کا نہج الگ ہے۔ ہم تمہیں بتائیں گے کہ یہ سیرت کس طرح کی ہوگی۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ مجھے ہمت نہ پڑی کہ حامی بھر سکتا مگر افسوس اس بات کا ہے کہ میں یہ نہ پوچھ سکا کہ انکا منشاء کس نہج کی سیرت نبوی کا ہے'

مولانا سید سلمان ندوی مرحوم نادرِ روزگار عالم تھے۔ ان کی کتاب ''عائشہ صدیقہ'' میں آج بھی شاید کچھ اضافہ ہوسکتا ہے۔ وہ کتاب ان کے زمانہ طالب علمی کی تالیف ہے۔ سیرت النبی کے علاوہ بھی آپ کی متعدد کتب اردو زبان کا سرمایہ ناز ہیں۔ اتنی صاف ستھری زبانی' اتنا عام فہم اور واضح اسلوب کہ تم ہی وہ کسی کو میسر ہوا ہے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی معاصر شخصیات میں ایک بہت بڑا نام سید مناظر احسن گیلانی کا ہے۔ڈاکٹر صاحب نے اپنے اساتذہ میں سب سے زیادہ استفادہ مولانا گیلانی سے کیا اور متعدد مقامات پر اس کا ذکر بھی کیا۔مولانا کی معروف کتاب ''امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی'' پر پیش لفظ رقم کئے تو آپ کی حیات وخدمات پر بڑی جامع گفتگو فرمائی۔جامعہ عثمانیہ میں مولانا کی خدمات کے تناظر میں فرمایا۔

''جو کام امام غزالی نے کیا وہی کام اس جماعت کے استاد کو کرنا پڑتا تھا اور کوئی احیاء العلوم کا نی چاہیے۔ابھی تحریر میں نہ آئی ہو لیکن گزشتہ تیس سال سے سال بسال جامعہ عثمانیہ کے طلباء اس جدید علم الکلام سے مستفید ہوتے رہے اور نتیجہ یہ بتاتا ہے کہ ہمالیہ تلے کے براعظم کی ڈیڑھ دو درجن جامعات میں سے سب سے کم دیریت اگر کسی جگہ کو مل سکی تو وہ جامعہ عثمانیہ رہی ہے۔اور اس کا سہرا بہت بڑی حد تک صرف مولانا سید مناظر احسن گیلانی مدظلہ کے سر رہا ہے۔ڈاکٹر محمود احمد غازی صاحب نے اپنے جائزہ میں لکھا ہے کہ ڈاکٹر کی دلچسپی کا اصل میدان ''تدوین وتاریخ حدیث'' ہے اور علم کی یہ جہت آپ کو اپنے نامور استاد سید مناظر احسن گیلانی سے ملی۔گمان غالب ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے مولانا گیلانی کی کتاب ''تدوین حدیث'' سے یہ تحریک لی ہو۔

مولانا سید مناظر احسن گیلانی دارالعلوم دیوبند کے ممتاز فضلاء میں سے تھے۔اکابرین دیوبند جو تعلق اور نسبت تھی اس کا اظہار ''سوانح قاسمی'' میں ملتا ہے جو بانی دارالعلوم مولانا محمد قاسم نانوتوی کی سوانح کے علاوہ تعلیمی، علمی، مذہبی، کلامی، سیاسی اور سماجی خدمات کا جائزہ ہے۔اس تصنیف میں آپ دیوبند کی علمی وادبی تاریخ سمیٹ لائے ہیں۔اس ضمن میں آپ کی ایک کتاب ''احاطہ دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن'' کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔جسے مولانا اعجاز احمد اعظمی نے مرتب کیا ہے۔اور ملتان سے ارادہ تالیفات اشرفیہ نے شائع کیا۔دیوبند میں آپ نے شیخ الہند مولانا محمود الحسن، سید انور شاہ کشمیری، علامہ شبیر احمد عثمانی جیسے مشاہیر سے اکتساب کیا۔مولانا گیلانی کی علمی وروحانی زندگی کی ابتداء وانتہا دارالعلوم دیوبند کی علمی ودینی فضا تھی۔قاری محمد طیب فرماتے ہیں:

''احقر کی فرمائش پر آپ نے ''سوانح قاسمی'' تین جلدوں میں مرتب کی۔جو ایک شاہکار تصنیف ہے۔اس کے بارے میں جب احقر نے ان سے فرمائش کی تو بہت خوشی اور امنگ سے اسے قبول کرتے ہوئے لکھا میری علمی زندگی کی ابتداء ''القاسم'' سے ہوئی تھی اور شاید انتہا بھی ''القاسم'' (یعنی حضرت نانوتوی) ہی پر ہوگی۔چنانچہ یہی ہوا کہ سوانح قاسمی کی چوتھی جلد آپ نے شروع کی پانچ صفحے لکھنے پائے تھے کہ عمر ثانی نے جواب دیدیا۔اور ''القاسم'' پر انتہا ہوگئی۔''

دیوبند کے بعد مولانا حافظ محمد احمد صاحب کے ارشاد کے مطابق آپ کو جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں پروفیسر مقرر کیا گیا۔ڈاکٹر حمید اللہ آپ کے حالات میں لکھتے ہیں: ''قائما حبیب الرحمٰن خان شیروانی (وزیر مذہبی امور) کی

توجہ سے آپ کو فنون وسائنس کی جماعتوں میں سنی طلباء کو دینیات لازم پڑھانے کے لئے بطور لیکچرار لے لیا گیا۔ ۱۹۲۵ء میں جامعہ عثمانیہ ہی میں ڈاکٹر صاحب شعبہ دینیات میں فقہ کے لیکچرار مقرر ہوئے اور پھر شیعہ قانون میں قانون بین الاقوامی پڑھانے منتقل ہو گئے لیکن اس کے باوجود مولانا گیلانی سے علمی روابط استقراء رہے۔

مولانا گیلانی کو علوم عقلیہ کا بڑا شغف تھا' (آپ نے مولانا برکات احمد سے جو معقولات کے امام ہیں) ڈاکٹر حمید اللہ نے مولانا گیلانی کے جن اوصاف کا تذکرہ کیا ہے ان میں ایک بات آپ کا کسی خاص مسلکی وابستگی سے بلند تر ہونا ہے۔ اگر چہ آپ دارالعلوم دیوبند کے سند یافتہ اور فیض یافتہ تھے۔ تاہم بریلوی علماء بھی آپ سے عقیدت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا تاثر یہ ہے: ''مولانا میں علم وسیرت کی بڑی شان نظر آتی ہے کہ دیوبندی آپ کو اپنا کہتے ہیں تو بریلوی اپنا ان دونوں مکاتیب خیال کی انگریزی دور میں ملک جو مکافرت اور کشمکش تھی اس میں یہ اپنایا جانا حیرت انگیز ہے مگر مولانا حقیقت میں ان دونوں سے بھی بلند ہیں۔ یعنی آپ صرف مسلمان ہیں۔''

مولانا گیلانی نے عثمانیہ یونیورسٹی میں ایک عرصہ دراز تک تدریسی خدمات سرانجام دیں' یونیورسٹی میں تدریس کے علاوہ تحقیق کا شعبہ بھی آپ کے دائرہ اختیار میں تھا۔ اس تناظر میں آپ کے خیالات وافکار میں تنوع کا آنا ایک قدرتی امر تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے خیال میں مولانا کی علمی وسعت وبصیرت کے پس منظر میں ایک محرک یہ بھی تھا۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

''اس پندرہ سولہ سالہ خدمتِ جامعہ نے بڑا فرق پیدا کر دیا تھا۔ اب اس مولوی میں جو دیوبند سے دستار فضیلت باندھ کر آیا تھا اور اس پروفیسر میں جو ایک جدید وضع کی جامع میں درس دے رہا تھا کوئی نسبت تھی تو شاید یہی کہ وہ پہلے بھی پکے مسلمان تھے اور اب بھی''

ڈاکٹر حمید اللہ خود بھی ایسے ہی پکے اور سچے مسلمان تھے جو کسی ملک کے ترجمان نہیں کہے جاسکتے۔ نیز آپ کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ مسلمان مسالک ومذاہب کی بحث سے اوپر اٹھ کر کام کریں۔ شافعی المسلک ہونے کے باوجود آپ دیگر فقہی مذاہب کا بے حد احترام کرتے تھے اور اسی نظریہ کا ابلاغ چاہتے تھے۔ مولانا انصاری' مولانا عثمانی' مولانا ندوی اور مولانا گیلانی یہ سب اور دیگر احباب جن کا ذکر آپ کے ہاں کثرت سے ملتا ہے ان میں سے اکثریت حنفی فقہ کے پیروکار تھے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم لوگ بھی اپنے دینی رجحانات اور علمی رویوں پر نظر ثانی کریں اور وسعت قلبی اور مذہبی رواداری کو فروغ دیں۔ یہ وقت کا اولین تقاضا اور ضرورت ہے۔ بقول اقبال ضروری ہے کہ

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کیلئے نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر